مسلمانوں کا ذوقِ کتاب داری

برِّصغیر میں اور لاہور میں

جناب پروفیسر محمد سلیم صاحب

پنجاب پبلک لائبریری لاہور کا صد سالہ یادگاری جلسہ ۲۹ جنوری ۱۹۸۵ء کو جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی صدارت میں قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور کے سماعت خانہ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں یہ مقالہ پڑھا گیا تھا۔

طبعی لحاظ سے بھی عرب ایک ریگستان تھا اور علوم و فنون کی گرم بازاری کے لحاظ سے بھی بنجر تھا۔ جب اسلام آیا تو اس ریگستان میں علوم و فنون کی فصلِ بہار لہلہا اُٹھی۔ ہر گوشہ میں درس و تدریس کی بساط بچھی ہوئی تھی۔ ہر مسجد قال اللہ اور قال الرسول کے زمزمۂ جان فزا کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ علوم و فنون کی ایجاد اور اختراع میں مسلمانوں نے کسی دوسری قوم کا بارِ احسان نہیں اُٹھایا۔ کسی کے سامنے اُنھوں نے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ تمام علوم و فنون اُن کے اپنے طبع زاد ہیں۔ ان کے اپنے ذہن کی اختراع ہیں۔

ناخواندہ عرب کے ناخواندہ نبیؐ پر پہلی وحی جو نازل ہوئی وہ پڑھنے سے متعلق ہے:
اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ اور دوسری وحی جو نازل ہوئی وہ لکھنے سے متعلق ہے:
نٓ والقلم وما یسطرون۔ اس لیے مسلمانوں میں پڑھنے اور لکھنے کی تحریک قرآن مجید سے جاری ہوئی۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر دارِ ارقم بن ابی ارقم میں ایک مخفی مدرسہ

جاری فرمادیا۔ جہاں نئے نئے اسلام لانے والوں کو آپؐ تعلیم دیتے تھے۔ ہجرت کے بعد جب مدینہ منورہ میں آزاد فضا میسر آئی تو مسجدِ نبوی کی تعمیر کے ساتھ آپؐ نے صفہ کا مدرسہ بھی شروع کیا۔ یہ اسلام کا پہلا باقاعدہ مدرسہ تھا۔ جہاں سے مسجد اور مدرسہ کا دائمی رشتہ قائم ہو گیا۔ اس کے بعد جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے، جہاں جہاں انہوں نے مسجدیں تعمیر کیں وہاں مدارس بھی قائم ہو گئے۔

کتب نویسی کو مزید تقویت حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز (۱۰۱-۹۹ھ) کے فرمان سے حاصل ہوئی۔ آپ نے پوری مملکت میں اہلِ علم کو ترغیب دی کہ وہ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع کریں۔ پہلے مسلمانوں نے احادیث کے مجموعے تیار کیے۔ پھر ان کی تنقیح اور ترتیب میں مشغول ہو گئے۔ صدیوں سخت محنت اور جاں فشانی سے مسلمان علماء نے حدیث کی چھان پھٹک کا کام مکمل کیا۔ سقوطِ بغداد (۶۵۶ھ) تک سب سے اعلیٰ اور سب سے اشرف علم، علمِ حدیث تھا۔

کتب نویسی کی تحریک کو کاغذ سازی کی صنعت سے غیر معمولی تقویت پہنچی۔ کاشغر کے چینی قیدیوں سے (۱۰۵ھ) مسلمانوں نے یہ صنعت حاصل کی اور پھر ساری دنیا میں اس کو عام کر دیا۔ اس کے بعد کتب خانوں کا وجود میں آجانا لازمی امر تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ معاویہ بن یزید (۶۴ھ) نے اسلام میں پہلا کتب خانہ قائم کیا تھا۔ معمر نے بیان کیا ہے کہ امام زہری کی کتب اونٹوں پر لاد کر خلیفہ ولید ثانی کے کتب خانہ میں لائی گئی تھیں۔ اس کے بعد کتب نویسی اور کتب سازی کو فروغ حاصل ہوا۔

دمشق، بغداد اور قاہرہ عالمِ اسلام میں علوم و فنون کے مراکز تھے۔ مساجد میں درس و تدریس کی گرم بازاری تھی۔ شوقین طلباء دور دراز علاقوں سے سفر کر کے ان شہروں میں پہنچتے تھے اور فاضل اساتذہ سے علم حاصل کرتے تھے۔ علمی سرگرمیاں بھی شباب پر تھیں۔ علماء تصنیف و تالیف میں مشغول تھے۔ کاتب اور وراق کتابوں کی نقل نویسی میں منہمک رہتے تھے۔ بیت الحکمت اور خزانۃ الکتب کے نام سے اعلیٰ پیمانہ پر کتب خانے قائم ہو رہے تھے۔

کُتّاب تحسینِ خط میں مشغول تھے۔ عہدِ عباسی کا مشہور خطاط ابن مقلہ (۳۲۷ھ) نے ایک شاہی فرمان لکھ کر قیصرِ روم کو بھیجا تھا۔ قیصر خط کی رعنائی اور خوب صورتی سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے اس کو خزانہ میں محفوظ کر لیا (علم الکتاب از ابوحیان توحیدی ۴۱۲ھ۔ اردو ترجمہ ص ۱۵۔ طبع لاہور ۱۹۶۶ء) تزئین اور آرائشِ کتب کا فن اپنے عروج پر تھا۔ اوراقِ کتب پر نقش و نگار بنانے میں آب زر

استعمال کیا جاتا تھا۔ بغداد میں تاتاریوں نے اور صلیبیوں نے غرناطہ، اندلس میں مسلمانوں کے کتب خانے نذرِ آتش کیے۔ اس وقت کتابیں جل رہی تھیں اور سونا پگھل پگھل کر زمین پر بہہ رہا تھا۔ (البدایہ والنہایہ حافظ ابن کثیر)

علوم و فنون کی یہ ساری سرگرمیاں اور تزئینِ کتب کی یہ اعلیٰ روائتیں سارے عالمِ اسلام میں تقریباً یکساں فروغ پا رہی تھیں۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں سے مسابقت کرتے تھے۔ ابنِ حزم اندلسی نے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ فضل المغاربہ علی المشارقہ۔ یعنی اہلِ مغرب —— اندلس اور مراکش وغیرہ کی علمی فضیلت مشارقہ پر یعنی شام، ایران، خراسان پر۔

برِصغیر ہند و پاکستان کا خطہ دولتِ غزنویہ کے زمانے میں عالمِ اسلام کا حصہ بنا ہے۔ ایران اور خراسان سے آمدہ علماء اور فضلاء نے علمی سرگرمیاں اور تصنیفی روایات برِصغیر ہند و پاکستان میں منتقل کر دیں۔ پھر یہاں بھی بہار آ گئی۔ مساجد، مدارس اور خانقاہوں میں وہی علمی سرگرمیاں جاری ہو گئیں اہلِ علم اور اہلِ ہنر کی قدردانی ہونے لگی۔ جلدی ہی اس خطہ نے ترقی کر لی اور علم کی سرپرستی اور فروغ میں یہ خراسان اور ماوراء النہر کا ہم پلہ ہو گیا۔ البتہ یہاں کوئی ابنِ حزم پیدا نہیں ہوا۔ جو اس خطہ کے علماء اور فضلاء کے محاسن اور کارنامے بیان کرتا —— بلاشبہ یہ خطہ عالمِ اسلام میں دیر سے شامل ہوا ہے، مگر یہ کوئی فروتر حصہ نہیں تھا۔

دولتِ غزنویہ کا بانی سلطان محمود غزنوی خود بھی صاحبِ علم تھا۔ وہ فقہ کی ایک کتاب کا مصنف ہے۔ وہ علم کا شیدائی تھا۔ اس کے دربار سے چار سو علماء، فضلاء اور شعراء وابستہ تھے۔ اس نے غزنی میں ایک عالی شان کتب خانہ اور ایک عجائب خانہ قائم کیا تھا۔ (فرشتہ) پٹھان اور بلوچ قبائل میں اسلام کی اشاعت کے لیے اس نے مدارس قائم کیے تھے۔ انگریز مورخین نے اپنی سیاسی چالوں کے پیشِ نظر اس اولین فاتح کو بدنام کیا ہے۔ ورنہ وہ ہندوؤں پر بھی مہربان تھا۔ پھر مفتوح شہر لاہور کا گورنر اس نے اپنے ہندو خادم تلک کو مقرر کر دیا تھا۔ سومنات کی فتح کے موقع پر بھی اس کے ساتھ ہندو فوج تھی۔ قنوج کی فتح کے موقع پر رام آدیہ نے محمود کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا تھا جو محمود چرتر کے نام سے مشہور ہے۔ محمود نے خوش ہو کر اس کو ایک ہاتھی انعام میں دیا تھا۔ (معارف اعظم گڑھ) محمود کا نام اسلامی دنیا کے دوسرے علم دوست اور معارف پرور امراء مثلاً صاحب ابنِ عباد

اور خانخانان کے سامنے لیا جا سکتا ہے۔

عربی رسم الخط کی ایک عجیب و غریب خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب بھی کوئی نئی اسلامی سلطنت قائم ہوئی اور نیا دارالحکومت بنا تو وہاں نیا خط ـــ طرزِ نگارش ـــ وجود میں آگیا۔ کوفہ دارالحکومت بنا تو خطِ کوفی وجود میں آیا۔ بغداد دارالحکومت بنا تو وہاں خط نسخ ایجاد ہوا۔ ایل خانیوں نے تبریز کو دارالحکومت قرار دیا تو وہاں خطِ تعلیق ایجاد ہوا۔ عثمانیوں نے قسطنطنیہ کو خلافت کا مستقر قرار دیا تو وہاں خطِ دیوان وجود میں آیا۔ تیموریوں نے ہرات کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہاں خطِ نستعلیق وجود میں آیا۔ انہی روایات کے تتبع میں جب اسلامی حکومت کو دہلی میں استحکام حاصل ہوا تو وہاں خطِ بہار وجود میں آیا۔ خطِ بہار ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ اور یہاں ہی اس نے فروغ پایا۔

نظام الملک طوسی کے بعد عالمِ اسلام میں مدارس قائم کرنے کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا۔ نظامیہ بغداد، نیشاپور وغیرہ ـــ بڑے بڑے مدارس بھی قائم ہوئے جیسے مدرسہ مستنصریہ بغداد جس کی عمارت آج تک موجود ہے۔ لیکن عالم اسلام کا سب سے بڑا مدرسہ ربع رشیدی (ربع CAMPUS) تھا جو تبریز کے قریب قائم ہوا تھا۔ اسی کو ایل خانیوں کے وزیراعظم رشید الدین فضل اللہ نے قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ کیا تھا اہلِ علم کی ایک بستی تھی۔ جو کئی سو ایکڑ رقبہ پر محیط تھی۔ جہاں سیکڑوں سقے، لکڑہارے، نان پز، باورچی، خدمت گار دن رات مشغولِ کار رہتے تھے۔ طلبا اور اساتذہ کی یہ اعلیٰ قسم کی بستی تھی۔

ایسا ہی ایک مدرسہ فیروز شاہ تغلق (۹۰، ھ) نے دہلی میں قائم کیا تھا۔ یہ ۷۰ ایکڑ پر محیط تھا۔ مدرسہ کی عمارت دو منزلہ تھی۔ گنبد کے اطراف میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوتے تھے۔ غروب آفتاب کے وقت عجب خوش نما منظر بن جاتا تھا۔ مدرسہ میں شیرازی قالین بچھے رہتے تھے۔ خوراک میں تیتر بٹیر مچھلی کا گوشت دیا جاتا تھا۔ اساتذہ کو پان کے بیڑے چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے دیئے جاتے تھے۔ گرمیوں میں ذائقہ دار شربتوں سے ان کی تواضع کی جاتی تھی۔ اساتذہ شامی جبے پہنتے تھے اور مصری دستار باندھتے تھے۔ مطہر دہلوی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے ہیں۔

ان مدارس میں اساتذہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر مستقل مزاجی سے درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے شوق اور مستقل مزاجی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ

ہلاکو خاں کے ہاتھوں اہلِ بغداد کے سر سے ایک قیامت گزر گئی۔ چالیس دن تک قتل و غارت گری اور آتش زنی ہوتی رہی۔ جب تباہی اور بربادی ختم ہوئی تو ہلاکو خاں اُجڑے اور تباہ حال شہر کے نظارے کے لیے نکلا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ مدرسہ مستنصریہ میں حسبِ سابق استاد اور طلبہ موجود ہیں اور درس و تدریس میں مشغول ہیں۔ گویا اس شہر میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ (الفخری۔ ضیا طباطبائی)

اس سے ملتا جلتا واقعہ دہلی میں بھی پیش آیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزی فوجیں دہلی پہ گولہ باری کر رہی تھیں۔ میاں جی نذیر حسین کی مسجد میں گولے آ آکر گر رہے تھے۔ محمد اشرف سندھو لکھتے ہیں۔ اس حالت میں بھی حدیث کا درس برابر جاری تھا۔ میاں جی استقلال کا پہاڑ بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ بمصداق آیت کریمہ: الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔

درس و تدریس کے ساتھ ساتھ یہ علما تصنیف و تالیف میں بھی وقت صرف کرتے تھے۔ بعض علما تو مسلسل لکھتے رہتے تھے۔ ابوریحان البیرونی (۱۰۵۱ء) کے متعلق یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے۔ "بیرونی ہمیشہ علم کے حاصل کرنے میں مشغول رہتا تھا۔ قلم کو ہاتھ سے اور آنکھ کو کتاب سے کبھی جدا نہیں کرتا تھا۔ سال میں صرف دو دن ایسے تھے کہ وہ فارغ رہتا تھا۔ وہ نوروز اور مہرجان کے تہوار تھے۔ ان دنوں میں وہ دوست احباب کے لیے کھانا تیار کرتا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ اس لیے کہ وہ مجرد تھا۔ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔

ہمارے یہاں بھی ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ مولانا وحید الزمان حیدرآبادی تھے (۱۸۷۰ء) وحید اللغات میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "میری عمر اب ۷۰ سال کے قریب ہے، لیکن اللہ کے فضل و کرم سے آنکھ اور ہاتھ کی قوت مثلِ ایامِ جوانی ہے ـــ ابھی تک کئی میل پیدل لیتا ہوں" اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ صبح چھ بجے سے شام پانچ بجے تک برابر لکھتا رہتا ہوں اور وہ بھی روزانہ۔ یہاں تک کہ یوم العید کو ناغہ نہیں کرتا۔ بڑے بڑے قوی اور مضبوط جوان چھ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میں گیارہ گھنٹے برابر لکھتا رہتا ہوں۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ باوجود اس کے کہ غذا میری دو پیسہ بھر چاول اور ایک پیسہ بھر آٹا ہے اور سادہ شوربا اور کسی قدر دودھ ہے۔ دودھ آدھ پاؤ سے زیادہ نہیں (شاہی ڈبل پیسہ مراد ہے)۔

ایک ایسے ہی کثیر التصانیف بزرگ نواب صدیق حسن خاں، نواب بھوپال تھے۔ ان کے شوقِ تصنیف کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ وہ جب شادی بیاہ میں شرکت کے لیے جاتے تھے تو اپنا بستہ کتب اور قلمدان ضرور ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے میں عموماً دیر ہو جاتی ہے وہ ایسی حالت میں ایک گوشہ میں بیٹھ کر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

اس دور میں کتابوں کی قدر و منزلت بھی بہت زیادہ ہوتی تھی۔ امرا اور حکمران کتابوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ خاص طور پر مصنّف کا اوّلین نسخہ حاصل کرنے کے لیے۔ ابو الفرج اصفہانی اموی (۳۵۶ھ) نے ادب کی مشہورِ زمانہ کتاب الاغانی تصنیف کی۔ اندلس کے خلیفہ الحکم ثانی (۳۶۶ھ) کو اس کا علم ہو گیا۔ اس نے اس کے لیے ایک ہزار دینار (از سرخ) صرف کر کے پہلا نسخہ حاصل کیا۔

ہمارے یہاں محمد شاہ تغلق (۷۵۲ھ) بڑا عالم فاضل بادشاہ گزرا ہے۔ اس کو معلوم ہوا کہ مشہور عالمِ دین قاضی عضد الدین ایجی کتاب مواقف لکھ رہے ہیں۔ بادشاہ نے مولانا معین الدین عمرانی دہلوی کو ایران ان کی خدمت میں بھیجا کہ وہ ہندوستان تشریف لے آئیں اور مذکورہ کتاب بادشاہِ دہلی کے نام منسوب کریں۔ تحفہ تحائف اور انعام اکرام لے کر ہندی سفارت روانہ ہوئی۔ جب شیراز کے بادشاہ ابو اسحاق (۷۴۴ھ) کو ہندی سفارت کا علم ہوا وہ قاضی عضد الدین کے جانے میں مانع ہوا۔ اُس نے قاضی سے کہا میں آپ کی ہر طرح خدمت کرنے کو تیار ہوں یہ میرا تخت حاضر ہے، میری منکوحہ کے علاوہ جو شے آپ چاہیں لے سکتے ہیں، لیکن شیراز چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے بعد قاضی نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔

اہلِ علم اور اہلِ فن کی قدر دانی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی سے متعلق ہے۔ ترکوں اور ایرانیوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ۹۲۰ھ میں ہوئی ہے جو جنگ چالدران کے نام سے مشہور ہے۔ جنگ میں جب شکست کے آثار نظر آنے لگے تو شاہ اسمٰعیل صفوی نے نادرۂ روزگار خطاط محمود اور نادرۂ روزگار مصوّر بہزاد کو پہاڑوں میں کہیں چھپا دیا تاکہ شکست کی صورت میں عثمانی فوج ان دو نایاب فن کاروں کو قسطنطنیہ نہ لے جائیں۔ دار السلطنت اصفہان کے مال و متاع سب کے مقابلہ میں اُس نے صرف فن کاروں کی حفاظت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ان افراد کی کیا قدر و قیمت تھی۔

اس سے ملتا جلتا واقعہ ہمارے یہاں بھی پیش آیا ہے۔ کھمبائت کی جنگ سے واپسی کے موقع پر ایک گروہ نے ہمایوں بادشاہ کے خیمہ پر شبخون مارا۔ اور سارا مال و متاع لوٹ کر لے گئے۔ اس میں تاریخ تیموری کا وہ نایاب نسخہ بھی تھا۔ جس کو بہزاد نے مصور کیا تھا۔ اس کے لیے ہمایوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ سارے لشکر کو پھیلا دیا کہ وہ نسخہ تلاش کر کے لائیں۔ جب تک وہ نسخہ دوبارہ حاصل نہ کر لیا، وہاں سے کوچ کا حکم نہ دیا۔ (اکبر نامہ۔ جلد اول۔ ص ۱۳۶)۔

برصغیر کے شہروں میں لاہور کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۴۱۳ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اس شہر کو فتح کیا تھا، بعد میں اپنی ہندوستانی سلطنت کا اس کو مرکز بنایا۔ لاہور نے بڑی جلدی ترقی کی۔ حتیٰ کہ اس کو غزنیٔ خورد کہنے لگے۔ یہاں سلطان ابراہیم بن مسعود (۴۵۰ – ۴۹۲) جب حکمران ہوا، جو سال میں دو قرآن اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا اور حرمین شریفین بھیج دیتا تھا۔ یہاں باہر سے علماء اور مشائخ آنے شروع ہو گئے۔ مثلاً سید اسمٰعیل محدث (۴۲۸ھ) سید حسین زنجانی (۴۳۱ھ) ابوالحسن علی ہجویری (۴۶۵ھ) علم و فضل کے ساتھ شعر و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ابوالفرج ملتی (۴۹۲ھ)۔ مسعود سعد سلمان (۵۱۰ھ) اس دور کے شعراء ہیں۔

ہندو دور میں کتابیں تاڑ کے پتوں پر یا بھوج پتر پر لکھتے تھے۔ پتوں کے درمیان میں سے ایک دھاگہ گزار کر ان پتوں کو نتھی کر لیتے تھے۔ جب مسلمان یہاں آئے تو اپنے ساتھ عالم اسلام کی علمی روایات اور کتاب سازی کے طریقے بھی لائے۔ مسلمان یہاں کاغذ لائے۔ انہوں نے سمرقندی، کشمیری، ہیزن کوٹی (سندھی)، قطنی (روئی کا) مختلف اقسام کے کاغذ بنائے۔ مسلمانوں نے یہاں آکر جلد سازی کا فن سکھایا۔ آرائش کتب اور جلد سازی نے اس وقت ایک مستقل فن کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب کی تیاری میں مختلف فن کار حصہ لیتے تھے۔ مثلاً کاتب، مذہب، جدول کش، مجلد، صحاف، زرکوب، لاجورد شو اور کاغذ فروش۔ اس دور کی لاہور میں تیار کی ہوئی بعض کتابیں دنیا کے کتب خانوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ بھجۃ النفوس والاسرار فی تاریخ معجزۃ المختار اس کا نام ہے۔ اس کا مصنف عبداللہ بن عبدالملک ہے۔ اس کا کاتب ابو حامد بن ایوب بخاری ہے۔ تاریخ کتابت ۲۸ جمادی الاخریٰ ۴۳۶ھ ہے۔ یہ سلطان مودود بن مسعود غزنوی کا زمانہ ہے۔

لاہور کی یہ رونق صنعت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ ۶۳۹ھ / ۱۲۴۱ء میں ایک تاتاری حملہ آور ستے شوالک کی پہاڑیوں کے راستے داخل ہو کر لاہور پر حملہ کر دیا۔ اور اس کو بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔ آئندہ ایک صدی تک پھر لاہور کا نام سننے میں نہیں آیا۔ مغل حکمرانوں کے دور میں لاہور کو پھر عروج حاصل ہوا۔ مغل سلطنت میں آگرہ کے بعد یہ دوسرے درجے کا شہر تھا۔ دوبارہ یہ شہر علماء و فضلاء کا ملجا و ماویٰ بن گیا۔ مغل حکمران خود بھی اہلِ علم ہوتے تھے۔ لاہور کا پہلا مغل گورنر مرزا قلیج خان تھا وہ مرزا دانیال کا خسر اور اکبر بادشاہ کا سمدھی تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ کچہری جانے سے قبل ڈھائی گھنٹے تک وہ طلبہ کو گھر پر تعلیم دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑا کتب خانہ تھا۔

مغل بادشاہوں کو فنِ خطاطی اور فنِ کتاب سازی سے عشق تھا۔ ہر فن کار کی قدر افزائی ہوتی تھی۔ مغل حکمران صفویوں سے عثمانیوں سے اور ازبکوں سے فن کی قدر دانی میں مسابقت کرتے تھے۔ لاہور میں مسجد وزیر خاں کے پاس کاتب صحاف، اور وراق بیٹھے رہتے تھے۔ یہ لوگ نہایت سعجلت سے لوگوں کو حسبِ منشا کتابیں نقل کر دیتے تھے۔ اس حیثیت سے یہ بغداد کے سوق الوراقین سے مشابہت رکھتا تھا۔ بانیٔ مسجد وزیر خاں نے اوّل روز سے اس کو اہلِ علم و فضل کا مرکز بنانے کی کوشش کی تھی۔ وصیت نامہ میں انھوں نے لکھا تھا:

> "اِس مسجد کا امام اور خطیب ایک ہی ہو جو بڑا خوش قراءت اور نماز کے احکام کا بڑا عالم ہو۔ نیز یہ شرط ہے کہ مشرقی دروازہ کے باہر بیس دکانیں مع بالا خانوں کے اسلامی کتب کے صحافوں (جلد ساز، کتب فروش، جملہ کتب بیچنے والے) کے بیٹھنے کے لیے ہوں گی اور وہ ہمیشہ بے کرایہ بیٹھیں گے۔ نیز شرط یہ ہے کہ مسجد میں دینی علوم کی تعلیم کے لیے دو مدرس ہوں گے اور ان کو مذکورہ اوقاف میں سے حق الخدمت دیا جائے گا۔
> امام اور خطیب کو ایک روپیہ سے دس روپیہ روزانہ تک، مؤذن کو چار آنہ یومیہ — ہر ایک مدرس کو ایک روپیہ۔ مرقومہ رمضان المبارک ۱۰۵۱ھ (وقف نامہ مسجد وزیر خان۔ درج کتاب قانونِ وراثت از مولانا غلام دستگیر نامی ص ۲۴۰)۔

اِس وصیت نامہ کی وجہ سے اس مسجد میں علماء، فضلاء، شعراء اور ادباء کا مجمع لگا رہتا تھا۔ خاص طور پر جمعہ کے روز یہاں مباحثے، مذاکرے، مناظرے اور مشاعرے منعقد ہوتے رہتے تھے۔

اس لحاظ سے یہاں جامع منصور بغداد اور جامع عمرو بن العاص قاہرہ کی روایات زندہ ہوگئیں سکھوں کے عہد تک یہ علمی سرگرمی اس مسجد میں بدستور جاری رہی۔

پاکستان میں انگریزی عہد کی قدیم لائبریری سکھر میں ہے۔ جہازران کمپنی (INDUS FLOATLA کے مینجر ہنری پوٹنجر (HENRY POTTENGER) نے ۱۸۳۹ء میں اس لائبریری کو قائم کیا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں اس کو پبلک لائبریری بنا دیا گیا۔ اور عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔ آج بھی اس کو سکھر پبلک لائبریری کہتے ہیں۔

اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لائبریری قدیم ہے۔ یہ پاکستان کی عظیم لائبریری ہے۔ اس کا مشرقی زبانوں کا حصہ نہایت قابلِ قدر ہے۔ حافظ محمود شیرانی اور پروفیسر شفیع کی کوششوں سے یہاں نادر کتب کا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ سندھ کی علمی تاریخ کے لیے علی شیر قانع کی کتاب تحفۃ الکرام ایک ناگزیر کتاب ہے۔ اس کا اصل نسخہ مصنف کا قلمی یہاں موجود ہے۔ علی شیر نوائی ہراتی کا مقام ترکی شاعری میں ایسا ہے جیسا کہ اُردو میں غالب کا ہے۔ مگر ترکی دنیا میں اس کا دیوان مفقود ہے۔ وہ یہاں اس لائبریری میں رکھا ہوا ہے۔

اس کے بعد پنجاب پبلک لائبریری ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اس کا آغاز ہوا ہے۔ اس کو علم دوست افراد اور افسروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ اس وجہ سے اس نے غیر معمولی انداز میں ترقی کی ہے۔ یہاں بھی کثیر کتب جمع ہیں۔ اس لائبریری کا شمار برصغیر کی چیدہ لائبریریوں میں ہوتا ہے۔ سرکاری مطبوعات سب یہاں موجود ہیں۔ یہ لائبریری اس علمی شہر کے شایانِ شان ہے۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔ (ادارہ)